حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیرہویں قسط)

لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں

رمضان ۱۳۷۴ھ (تقریباً مئی ۱۹۵۵ء) تک ہماری رہائش برنس روڈ کے قریب کیمبل اسٹریٹ کے ایک فلیٹ میں تھی۔ اس فلیٹ میں ہم پانچ سال مقیم رہے۔ یہ زمانہ بڑا بابرکت ثابت ہوا۔ اسی قیام کے دوران اُس حج کی توفیق ہوئی جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ یہیں پر بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم نے حفظ قرآن کی تکمیل کرکے پہلی محراب سُنائی، یہیں رہتے ہوئے نانک واڑہ میں دارالعلوم قائم ہوا، اور ہماری باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ یہیں پر ہماری بڑی بہن محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ جو دیوبند سے بیوہ ہوکر آئی تھیں، ان کا نکاح حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ یہیں پر ہماری دوسری بہن جنہیں ہم چھوٹی آپا کہتے ہیں، ان کا نکاح لاہور کے جناب حافظ شفقت علی صاحب مرحوم سے ہوا، اور یہیں ہمارے دوسرے بڑے بھائی جناب محمد رضی صاحب مرحوم کا نکاح ہوا جو حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا۔ اور یہیں رہتے ہوئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دوسرے رفقاء نے بورڈ تعلیمات اسلامیہ میں پاکستان کے دستور کی اسلامی بنیادیں طے کیں جن کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء کا دستوری مسودہ مؤثر اسلامی دفعات کے ساتھ تیار ہوا (اگرچہ بعد میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور یہ توڑ کر ملک کو پٹڑی سے اتار دیا، اور یہ مسودہ طاق نسیان میں چلاگیا)

لیکن یہ مکان بھی کرایہ کا تھا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ کراچی میں مکان اپنا ہو۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ ہندوستان سے ہجرت کے وقت اچھی خاصی جائیداد کے مالک تھے، جس میں وسیع گھر کے علاوہ کچھ آبائی زرعی زمینیں تھیں، اور ایک باغ بھی تھا، جوانہوں نے بڑے شوق سے

لگایا تھا، اور جس سال آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی، اس سال اس پر آم کا پہلا پھل آرہا تھا، لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جس دن میں نے اس گھر اور باغ سے قدم باہر نکالا، وہ گھر اور باغ میرے دل سے نکل گئے۔ چنانچہ پاکستان ہجرت کے بعد یہ تمام جائیدادیں ہندوستان کی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیں۔

بالآخر پاکستان اور ہندوستان کے ایک معاہدے کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ آبادی کے تبادلے کے نتیجے میں جو لوگ اپنی جائیدادیں ایک ملک میں چھوڑ کر دوسرے ملک گئے ہیں، انہیں ایک خاص ضابطے کے تحت نئے ملک کی متروکہ جائیدادوں میں سے حصہ دیا جائیگا۔ اس طرح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی متروکہ جائیدادوں کے بدلے کراچی کے محلے لسبیلہ ہاؤس میں ایک پلاٹ ملا تھا جس پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چار کمروں کا مکان تعمیر فرمالیا تھا۔ (مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان چار کمروں کی تعمیر پر آٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔)

چنانچہ رمضان ۱۳۷۴ھ میں اُس کی تعمیر مکمل ہوگئی تھی، اور اُس میں منتقل ہونے کیلئے عید کا انتظار تھا۔ ہم بھائیوں نے یہ طے کیا کہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب اُسی مکان کی چھت پر شبینہ کر کے گذاری جائے۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم ماشاء اللہ حافظ ہیں۔ انہوں نے اپنے کئی ہم سبق حفاظ کو جمع کر کے تراویح ہی میں وہاں شبینہ کیا، اور غالباً دس یا بارہ پاروں کی تراویح میں تلاوت کی۔ اور عید کے بعد ۴ر شوال ۱۳۷۴ھ (مطابق تقریباً ۲۵ر مئی ۱۹۵۵ء) کو ہم اُس گھر میں منتقل ہوگئے۔

برنس روڈ کے مکان سے تو ہم پیدل ہی مدرسے چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن لسبیلہ ہاؤس کا مکان مدرسے سے تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر تھا، اس لئے وہاں ہم دونوں بھائی سائیکل پر جایا کرتے تھے۔ سائیکل حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم چلاتے، اور میں اُن کے پیچھے کیریر پر یا اگلے ڈنڈے پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا۔ کبھی کسی وجہ سے سائیکل میسر نہ ہوتی، تو بس میں بھی جانا پڑتا، اور اُس کے لئے دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں۔

لاہور اور دیوبند کا سفر

اسی تعلیمی سال کے دوران جب میری عمر بارہ سال تھی، میری والدہ صاحبہ کو دو سفر درپیش تھے، ایک سفر لاہور کا۔ اور دوسرے والدہ صاحبہ اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں سے ملنے کیلئے دیوبند بھی جانا چاہتی تھیں۔

اگرچہ یہ میری پڑھائی کا زمانہ تھا، اور اس سفر میں ایک مہینے سے بھی شاید کچھ زیادہ مدت لگنی تھی، اور اتنے دن کا ناغہ میری تعلیم کے لئے نقصان دہ تھا، لیکن میری عمر بارہ سال تھی، اور میری والدہ نہ میرے بغیر سفر کرتی تھیں، اور نہ میں ان کے بغیر رہ سکتا تھا۔ اس لئے میں بھی یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو انہی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تاکید فرمائی تھی کہ جب تک لاہور میں رہوں، جامعہ اشرفیہ میں اسباق میں شریک ہوجاؤں، اور جب تک دیوبند رہنا ہو، دارالعلوم دیوبند میں۔ چنانچہ لاہور پہنچ کر حسب معمول جب حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کا ذکر کیا، تو حضرتؒ نے بڑی شفقت سے متعلقہ اسباق میں بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ میں وہاں اپنے تمام اسباق میں شریک ہوتا رہا۔ حسن اتفاق سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے یعنی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو بعد میں جوانی ہی میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے تھے) اور حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب مدظلہم (موجودہ مہتمم جامعہ اشرفیہ) بھی اُس سال وہی کتابیں پڑھ رہے تھے جو میں پڑھ رہا تھا، اس طرح ان کے ہم سبق ہونے کا شرف حاصل ہوگیا، اور ہم تمام اسباق میں اکٹھے شریک ہوتے رہے۔

اگرچہ دارالعلوم میں اپنے اسباق کو میں جس مقام پر چھوڑ کر آیا تھا، ضروری نہیں تھا کہ یہاں بھی پڑھائی اُسی مقام پر ہوتی، دوسرے کسی نئے استاذ سے مناسبت پیدا کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے اس طرح سفر کے نتیجے میں جو تعلیمی نقصان ہونا تھا، اُس کی پوری تلافی تو نہیں ہوسکتی تھی، لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہوجانا بہتر تھا، اس لئے میں نے اسی کو غنیمت سمجھا تھا۔ اور بعد میں یہ غنیمت غنیمتِ کبریٰ اس طرح بن گئی کہ ہمارے شرح جامی اور شرح تہذیب کے استاد چھٹی پر چلے گئے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ یہ مفلسی میں آٹا گیلا ہوگیا، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے دونوں صاحبزادوں سے جو میرے ہم سبق تھے، یہ تجویز پیش کی کہ ہم حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں چل کر اُن سے درخواست کرتے ہیں کہ ان دو کتابوں کے پڑھانے کے لئے کسی دوسرے استاد کا انتظام فرمادیں۔ چنانچہ ہم تینوں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور یہ درخواست پیش کی۔ حضرتؒ ہماری یہ درخواست سُن کر کھل اُٹھے، اور جواب میں ایسی بات ارشاد فرمائی جو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ فرمایا: "کچھ فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہ کتابیں پڑھائیں گے، اور ان کتابوں

کے گھنٹے میں یہاں میرے پاس آجایا کرو"۔ یہ سُن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ حضرتؒ نے عرصۂ دراز سے تدریس کا سلسلہ چھوڑا ہوا تھا۔ اپنی ٹانگ کٹنے کے بعد وہ ٹانگ سے معذور تھے، اور اس حالت میں اُن کا وجود سراپا رشد وہدایت تھا، اور ان کی مجلس ہمہ وقت اپنے شیخ حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں اور اُن کے افادات سے آباد تھی، اور اُس چھوٹی سی عمر میں وہ مجھے دنیا کے مقدس ترین انسان لگتے تھے، اور جب کبھی کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا خیال آتا، تو ان کے سوا کسی اور کی طرف ذہن نہیں جاتا تھا۔ ان کی موجودہ کیفیت دیکھنے والا کوئی شخص یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ شرح جامی اور شرح تہذیب جیسی کتابیں پڑھائیں گے۔ لیکن حضرتؒ نے اپنی شفقتوں سے نہال فرمادیا۔ ان کا مکان نیلا گنبد کے مدرسے کے ایک فلیٹ میں تیسری منزل پر واقع تھا۔ ہم روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور حضرتؒ کے درس کے دوران اندازہ ہوتا کہ تقدس اور ولایت کا یہ سراپا نحو اور منطق کی دقیق باتوں کو بھی کتنی آسانی سے سمجھا دیتا ہے۔ شرح جامی میں حاصل ومحصول کی بحث اچھی خاصی مشکل سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرتؒ نے ہمیں وہ بحث چٹکیوں میں سمجھادی تھی۔ اسی طرح شرح تہذیب کا اُس وقت کا نصاب ضابطے کی بحث تک ہوتا تھا، اور ضابطہ مشکل ہونے کی وجہ سے نصاب سے خارج تھا، لیکن حضرتؒ نے فرمایا کہ ہم تمہیں وہ بھی پڑھائیں گے، اور واقعۃً پڑھایا اور خوب پڑھایا۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃً واسعۃ.

تقریباً چھبیس دن لاہور کا قیام مکمل کرنے کے بعد ۲۷ رنومبر ۱۹۵۵ء کو والدہ صاحبہ کو دیوبند جانا تھا۔ اس سفر میں ہمارے بھائی جان (جناب محمد زکی کیفی صاحب مرحوم) والدہ صاحبہ کو دیوبند لے جانے کیلئے تیار ہوگئے، اور ان کی رفاقت میں ہم ریل کے ذریعے روانہ ہوئے۔ اُس زمانے میں ہندوستان کا سفر نت نئی مشکلات کا حامل تھا۔ کسٹم سے گذرنا، اور اُس کے بعد ریل میں سوار ہونا دنیا کے میدان حشر سے کم نہ تھا۔ اس ریل نے امرتسر پہنچایا، اور وہاں سے دوسری ٹرین ملی جس نے پورا مشرقی پنجاب عبور کرکے رات گئے دیوبند کے اسٹیشن پر اُتارا۔ میرے بچپن کے ذہن میں دیوبند کی جگہوں کا جو تصور تھا، اب چھ سال میں کراچی اور لاہور کی شہری زندگی کا عادی ہوجانے کے بعد وہ ساری جگہیں بہت چھوٹی نظر آرہی تھیں۔ میرے ذہن میں دیوبند کے اسٹیشن اور پلیٹ فارم وغیرہ کی جو تصویر بیٹھی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس تصویر کو یکا یک چھوٹا کردیا ہے۔ پلیٹ فارم پر رشتہ داروں کا بڑا مجمع تھا، اور والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے اُن سے ملنے اور سب کے

چہروں سے پھوٹتی ہوئی خوشی کا منظر قابل دید تھا۔

ہمارا قیام اپنے ماموں جناب انوار کریم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہوا۔ اگلے دن میں نے اپنی بچپن کی گلیوں اور اپنے مکان کا چکر لگایا، ہمارا مکان اب شرنارتھیوں کے قبضے میں تھا، مگر انہوں نے اندر آنے کی اجازت دیدی، اور اُس میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ کتبہ درسِ عبرت دے رہا تھا:

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو، کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

یہ شعر تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گھر کی تعمیر کے وقت کندہ کرایا تھا جب اس گھر کو چھوڑنے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، لیکن آج یہ شعر اُس کے نئے مکینوں کو عبرت دلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو چھوڑتے وقت اُس کی بالائی منزل کے ایک چھجے کے نیچے کوئلے سے ایک شعر لکھ آئے تھے۔ یہ کوئلے سے لکھا ہوا شعر بھی اُس وقت پڑھا جاتا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

بہر حال! اپنے گھر میں دوسروں کی اجازت سے داخل ہونے اور ان کا ممنون ہونے کے بعد ہم اپنے محلے میں نکلے، اُس کی ایک ایک چیز اپنی جگہ موجود تھی، لیکن چھوٹی نظر آرہی تھی، یہاں تک کہ وہ چوک جس کا تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں کہ وہ ہمارے لئے ایک بڑے میدان یا اسٹیڈیم کی حیثیت رکھتا تھا، اب یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ سمٹ کر ایک چھوٹا سا صحن بن گیا ہے۔

زندگی کے مختلف مراحل میں انسان مختلف چیزوں کو بڑا سمجھتا ہے، لیکن بعد میں جب ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے تو انسان اس بات پر ہنستا ہے کہ میں نے کس چیز کو بڑا سمجھا تھا۔ یہ دنیا بھی آج ہمیں بہت بڑی نظر آتی ہے، لیکن آخرت میں پہنچ کر جب اس کی حقیقت کھلے گی تو یقیناً اپنی اس کوتاہ نظری پر ہنسی آئے گی۔

بہر کیف! دیوبند کے قیام کے دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کے مطابق میں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے اسباق شروع کردیئے۔ شرح جامی اُس وقت حضرت مولانا نصیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھاتے تھے (جو بعد میں شیخ الحدیث بنے) الحمدللہ ان سے استفادے کی نوبت آئی۔ کنز الدقائق

اور شرح تہذیب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کے پاس تھی، اور مقامات حریری حضرت مولانا جلیل الرحمٰن صاحب کے پاس۔ میرے پھوپی زاد بھائی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دارالعلوم کے بڑے قابل اور مقبول استاد تھے، وہ بھی مقامات حریری پڑھاتے تھے، اور میری اور ان کی خواہش تھی کہ میں اُن کے پاس مقامات پڑھوں، لیکن اُن کے گھنٹے کا کنز الدقائق سے تعارض تھا، اس لئے میں اُن سے استفادہ کرنے سے محروم رہا، لیکن دیوبند کے اس سفر کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کا، غیر رسمی ہی سہی، طالب علم بننے کی سعادت حاصل ہوگئی، اور اُسی زمانے میں مجھے وہاں کے اکابر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میری عمر اتنی چھوٹی تھی کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دینے کا حوصلہ نہ ہوا، لیکن دور دور سے الحمد للہ زیارت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

میری ایک خالہ دیوبند سے کچھ فاصلے پر تحصیل کھتولی کے ایک گاؤں سرائے رسول پور میں مقیم تھیں۔ والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ اُن سے ملنے دو دن کے لئے وہاں بھی گئیں، اور میں ان کے ساتھ تھا۔ کھتولی وہ قصبہ ہے جو ہمارے روحانی جد امجد حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن تھا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک نہر کے کنارے کنارے سرائے رسول پور جاتی تھی۔ اس سڑک پر رکشہ کے ذریعے ہم سرائے رسول پور پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت اور سرسبز وشاداب گاؤں تھا جس کی واحد مسجد کی امامت ہمارے خالو کرتے تھے، اور اسی وجہ سے ہماری خالہ وہاں مقیم تھیں۔ یہ دو دن اس گاؤں میں بڑے پرلطف گذرے۔ خالص دیہاتی ماحول کا پہلی بار مشاہدہ ہوا، اور اسی میں یہ دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا کہ ہماری خالہ کی ایک پڑوسن کو جب پتہ چلا کہ ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں، تو انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا۔ یہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں، اور میں چونکہ بارہ سال کا بچہ تھا، اس لئے انہوں نے مجھ سے پردہ بھی نہیں کیا۔ گھر میں بٹھا کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کراچی سے آئے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، تو اُنہوں نے کہا: "تم میرے بیٹے حسین کو تو جانتے ہوگے، اُس کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا: "میں تو ان کو نہیں جانتا" اس پر خاتون کی حیرانی قابل دید تھی، انتہائی تعجب کے لہجے میں وہ بولیں: "ہائے! تم کراچی میں رہتے ہو، اور حسین کو نہیں جانتے؟" میں نے کہا: "وہ کہاں رہتے ہیں؟" کہنے لگیں": ارے وہ اُسی کراچی میں رہتا ہے جس میں تم رہتے ہو"۔ اب میں سمجھا کہ یہ خاتون کراچی کو بھی سرائے رسول پور پر قیاس فرما رہی ہیں کہ

جیسے یہاں رہنے والا ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہے، اسی طرح کراچی کا ہر باشندہ بھی ایک دوسرے کو جانتا ہوگا۔ اس پر میں نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ اُس کا ایک سرا اگر یہاں سمجھا جائے تو دوسرا سرا میرٹھ میں ہوگا۔ یہ سن کر وہ اس قدر حیران ہوئیں جیسے میں انہیں الف لیلہ کی کوئی کہانی سُنا رہا ہوں۔

اب خیال آتا ہے کہ جب قرآن کریم جنت کے بارے میں یہ فرماتا ہے کہ اُس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک ادنیٰ جنتی کو اتنا بڑا رقبہ دیا جائیگا جو پوری دنیا سے دوگنا زیادہ ہوگا، تو اُس پر ہماری حیرت اُس دیہاتی خاتون کی سی ہوتی ہے جو کراچی شہر کے بارے میں یہ تصور کرنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ سرائے رسول پور سے اتنا زیادہ بڑا ہوگا کہ اُس میں ایک باشندہ دوسرے کو پہچانتا نہیں ہوگا، اور جس کی سادگی پر ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ لیکن وہ انبیاء کرام جو یا تو اپنی آنکھوں سے عالم بالا کی سیر کر آئے ہیں یا عالم بالا کے پیدا کرنے والے نے براہ راست ان کو وہاں کی خبر پہنچادی ہے، وہ ہم دنیا کے دیہاتیوں کو حیرت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر بھی انکو ہم پر ہنسی نہیں، ترس آتا ہے۔

بہر کیف! اپنی والدۂ محترمہ کے ساتھ لاہور اور دیوبند کا یہ سفر بڑا پر کیف بھی تھا، اور میرے لئے بہت سی سعادتوں کا بھی سبب بنا۔

وہاں سے واپس آ کر میں لاہور ہی میں تھا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ جمعیت علماء اسلام کی طرف سے مغربی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے لاہور تشریف لائے، اور آگے پنجاب اور صوبہ سرحد کے دورے پر روانہ ہونے کا پروگرام تھا۔ اس سفر میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت نصیب ہوئی جس کی کچھ تفصیل ذکر کرنے سے پہلے حضرت والد صاحبؒ کی اُس وقت کی مصروفیات کا کچھ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

جاری ہے..........

☆☆☆